باب دوم

یتیم شہزادہ

یہ 1928ء کی بات ہے۔

جستروال کے میلے اور ملگجے ماحول میں ساڑھے چار سالہ اختر اب اکیلا تھا۔ احساس تنہائی کا شکار، رنجیدہ اور اداس۔ اس کے ابا اب اس دنیا میں نہیں تھے۔ اس کی آپا فاطمہ اور پشاور کے ڈبگری محلے کا کشادہ گھر، اب ان میں سے کوئی چیز یہاں نہیں تھی۔

ابھی کچھ دن پہلے تک یہ سب کچھ، کچھ اس طرح نہیں تھا۔ وہ کالے رنگ کی گاڑی میں بیٹھ کر کنڈرگارٹن جایا کرتا تھا اور اس کے ابا جن کے سر پر کلف لگی پگڑی کا طرہ لہراتا تھا، پیار سے اسے اپنے پاس بلاتے اور اس سے باتیں کیا کرتے تھے۔ اس کا ننھا سا ذہن یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ سب کچھ اس سے کیوں چھین لیا گیا ہے۔ ''مجھے میرے گھر لے چلو' وہ اپنی ماں اور آپا سے کہتا ۔ وہ اس بات پر حیران تھا کہ وہ کیوں اس کی بات نہیں مانتیں۔ جب وہ زیادہ اصرار کرتا یا رونے لگتا، تو اس کی اماں اسے خود سے چمٹا لیتیں اور خود بھی رونے لگتیں۔

وہ ایک اور طرح کا گھر تھا، بہت اونچا اور بہت کشادہ، جس میں کچھ اور لوگ بھی تھے۔ اس کے تایا سرور خان، اللہ داد خان اور محمد خان۔ اس گھر میں بہت سے باورچی خانے اور اینٹوں والے صحن میں بہت سے بچے کھیلتے دکھائی دیتے تھے۔ اس کی اماں نے بتایا کہ یہ سب اس کے بہن بھائی ہیں لیکن اس نے انہیں پہلے تو نہیں دیکھا تھا۔ اس نئے گھر میں شام پڑے بجلی کے قمقمے نہیں، گیس کے ہنڈے جلائے جاتے تھے۔

اختر کی اماں اور اس کی بہن آپا سلطان جو اس کے لیے کھانا پکاتیں اور اس کے ساتھ کھیلتی تھیں، اسے سمجھاتی تھیں کہ اب اسے اسی گھر میں رہنا ہے۔ انہوں نے اسے بتایا کہ اس کے ابا اللہ میاں کے پاس چلے گئے ہیں اور یہ ان کا دوسرا گھر ہے۔ آہستہ آہستہ اختر گردوپیش میں پرندوں، درختوں، بچوں اور بڑوں میں دلچسپی لینے لگا۔ وہ اب کچھ بدلا بدلا سا لگتا تھا، کھویا کھویا، اداس، اداس لیکن اب کبھی کبھار وہ ہم جولیوں سے کھیلنے لگتا، کبھی کبھار ہنس پڑتا، لیکن لاڈلے بچے میں زندگی بھر وہ شوخی لوٹ کر نہ آسکی۔

ضلع امرتسر کی اجنالہ تحصیل میں دریائے راوی کے کنارے جستروال کی یہ جاگیر سترہویں صدی میں شاہجہان نے ہرات سے آنے والے عادل خان کو عطا کی تھی۔ عادل خان اپنے اہل خاندان کے ساتھ لاہور سے کچھ دور قصور میں آ کر آباد ہوا تھا جہاں پہلے سے پٹھانوں کے کچھ بارسوخ اور طاقتور خاندان موجود تھے۔ انہی خاندانوں سے اگلی صدیوں میں کچھ اور اولوالعزم بھی پیدا ہوئے، جنہوں نے لوح زماں پر اپنے نقوش ثبت کیے۔

عادل خان مزاجاً ایک بلند عزم سپاہی تھا۔ اس نے اپنے قبیلے کے بڑے بوڑھوں سے اس زمانے کی کہانیاں سنی تھیں جب ہندو راجوں کا اقتدار کابل تک پھیل گیا تھا اور خراسان کے نومسلم پشتون قبیلوں پر خدا کی زمین تنگ کر دی گئی تھی، پھر غزنی کے ترکوں کی قیادت میں ایک طوفان نے برصغیر کو روند ڈالا۔ جہاں سے آنے والے لشکر، ارگن، ہلمند اور کابل کے وادیوں میں دندناتے، پشتونوں کی فصلیں جلاتے، ان کے باغات اجاڑتے، درخت

کاٹتے اور ان سے خراج وصول کیا کرتے تھے۔ ان لشکروں نے خراسان کی وادیوں اور پہاڑوں میں روشن کی گئی اسلام کی شمع گل کرنے کے لیے پشتونوں کا خون بہایا تو شمال کے اہل ایمان، ترک، تاجک، ازبک اور ہزارے ان کی مدد کو اٹھے، دریائے آموتک اور اس سے پرے ماورالنہر میں جہاں سینکڑوں ہزاروں میل کی وسعتوں میں نئے عقائد کی شمعیں پھڑ پھڑا رہی تھیں ہندوؤں پر پشتونوں کا قرض تھا جو انہیں اپنا غلام بنائے رکھنا چاہتے تھے۔ اپنا حساب چکانے کے لیے وہ غزنویوں، غوریوں اور مغلوں کے لشکروں کے ساتھ ہند کا رخ کرتے رہے۔ جہاں بت پوجے جاتے تھے اور انسان مختلف درجوں میں تقسیم کر دیئے گئے تھے۔

پندرہویں صدی کے وسط تک ہندوستان پر مغل اقتدار مستحکم ہو چکا تو خراسان اور ہمسایہ ایران سے اہل عزم کی آمد کا سلسلہ تیز تر ہو گیا جو سلطنت میں پیدا ہونے والے مواقع سے فیض یاب ہونا اور نئی سرزمین میں اپنے ہنر کی آزمائش کرنا چاہتے تھے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں خاندان میں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ عادل خان نے شاہجہان کے لشکر اور دربار تک کیسے رسوخ حاصل کیا، تاہم خاندان کی بڑی بوڑھیاں اب بھی اپنے پوتوں اور نواسوں کو بتاتی تھیں کہ خان دادا (عادل خان) اس چھتی ہوئی ڈیوڑھی کے نیچے سے چغتائی (مغل) دلہن کا ڈولا لے کر آئے تھے۔

چھوٹی اینٹوں کی یہ اونچی حویلی اختر اور صحن میں کھیلنے والے دوسرے بچوں کے پردادا بدرالدین خان نے تعمیر کی تھی۔ انیسویں صدی میں سکھوں نے جو مغلوں کے زوال کے ساتھ ایک نئی قوت بن کر اٹھے اور پنجاب پر قابض ہو گئے تھے اور جن کا مرکز چند میل دور امرتسر میں تھا، جستر وال کی جاگیر کا بڑا حصہ ہتھیا لیا تھا لیکن اب بھی اس خاندان کے پاس سینکڑوں ایکڑ زرعی زمین موجود تھی جس پر گندم، گنے اور کپاس کی فصلیں اگتی تھیں۔ گاؤں سے چند میل دور وہ پرانی بارہ دریاں اب بھی شکستہ حالت میں موجود تھیں جو عادل خان یا شاید اس کے بیٹے سلطان خان کے دور میں تعمیر کی گئی تھیں۔ بارہ دریوں کے گرد بنائی گئی سیر گاہیں زمانہ ہوا اجڑ چکی تھیں اور عمارتوں کی عشروں سے مرمت نہیں کرائی گئی تھی لیکن اب بھی گاؤں میں یہی سب سے معتبر خاندان تھا جس کی حویلیوں میں اعلیٰ نسل کے چند گھوڑے ہمیشہ موجود رہتے تھے۔

عادل خان کے بعد نسل در نسل اس کے وارث، مغل دربار سے وابستہ رہے۔ تا آنکہ مکمل زوال نے چغتائیوں کا گھر دیکھ لیا۔ مسلم برصغیر کے اخلاقی، عسکری اور سیاسی زوال نے آخر کار مغلوں کے قلعے میں دراڑ ڈال دی۔ جو ان کے اجداد کی فلک آسا بلند ہمتی نے تعمیر کیا اور جسے اب ان کی کم نظری اور سہل کوشی نے ریت کا گھروندہ بنا دیا تھا۔ عالمگیر کے بعد بہادر شاہ ظفر کی علامتی حکمرانی کے خاتمے تک، 150 سال کے عرصے میں، ان گنت قبیلوں اور خاندانوں نے مسلسل کمزور ہوتی ہوئی مرکزی حکومت کا ساتھ چھوڑ دیا، ان میں پشتون قبائل بھی شامل تھے لیکن عادل خان کی اولاد آخری وقت تک ان کے ساتھ رہی، جن کی رگوں میں اب مغل ننھیال کا خون بھی تھا، بارہا ایسے مشکل مرحلے آئے جب مغلوں کا ساتھ نبھانے میں خسارے کے سوا کچھ نہ تھا۔ پنجاب پر ان کا کنٹرول باقی نہ رہا تھا لیکن ان کا استدلال یہ تھا کہ مغل دربار برصغیر میں مسلم اقتدار کی علامت ہے، لہٰذا اس سے وفاداری اسلام سے وفاداری کی طرح ہے۔

1857ء کی جنگ آزادی چھڑی تو بوڑھے بہادر شاہ ظفر سے جستر وال کا کوئی رابطہ تھا لیکن ایک صبح بدرالدین اپنی حویلی سے نکلے اور میدان جنگ کی طرف روانہ ہو گئے۔ انہیں اپنے پسندیدہ گھوڑے ''کلیا'' پر سوار ہو کر جاگیر سے نکلتے دیکھا گیا۔ گاؤں سے باہر کٹی گندم کے ڈھیروں کے درمیان، بوڑھے بدرالدین اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے اور ان کی آواز گونجی ''چل اوئے کلیا پار''۔ معلوم نہیں ان کے ساتھ راوی پار کا رخ کرنے والے شہسواروں کی تعداد کیا تھی اور وہ کہاں، کس معرکے میں کام آئے لیکن پھر ''کلیا'' اور اس کا سوار لوٹ کر گھر نہیں آئے۔ جستر وال کی باقی ماندہ جاگیر کا سردار اب بدرالدین خان کا بیٹا بلند خان تھا۔ جسے اب اس خاندان کو طوفانوں سے بچانا تھا جو دو اڑھائی سو سال سے زمانے کے بدلتے تیوروں کا سامنا

کرتا آیا تھا۔صرف تین سال پہلے پنجاب بھر میں سکھ اقتدار کا خاتمہ ہوا تھا۔اس کڑے زمانے میں بھی عادل خان کے خاندان نے اپنے آپ کو بچائے رکھا تھا،اگرچہ اس کی قوت کمزور پڑ گئی تھی،زمینیں محدود ہوگئی تھیں اور حالات کا رخ بدل گیا تھا۔

1857ء کے بعد پنجاب میں انگریزی اقتدار مستحکم ہوا تو رفتہ رفتہ مسلمانوں کے لیے محدود مواقع میں کسی قدر وسعت پیدا ہونے لگی۔شہروں میں انگریزی طرز کے سکول کھلنے لگے اور اگرچہ سکھوں اور ہندوؤں کے برعکس جن میں سے اول الذکر اقتدار چھن جانے پر آرزدہ تھے اور ثانی الذکر بتدریج معاشی زندگی پر اجارہ داری حاصل کر چکے تھے،یہ مواقع اب بھی کمتر تھے۔

بلند خان کے ہاں چار بیٹے پیدا ہوئے۔1865ء میں اس کے سب سے چھوٹے بیٹے عبدالرحمٰن نے جنم لیا۔سلیقہ مند بلند خان نے ان سب کو دینی تعلیم کے علاوہ جس کا خاندان میں ہمیشہ اہتمام کیا جاتا تھا،انگریزی سکولوں میں بھی تعلیم دلائی۔اس کا خاندان صدیوں سے سپہ گری سے وابستہ تھا لیکن اب باوقار زندگی کے لیے اعلیٰ تعلیم ہی واحد راستہ تھا۔بلند خان کے بیٹوں میں سے کوئی دوسرا تو تعلیم سے غیر معمولی شغف پیدا نہ کر سکا لیکن عبدالرحمٰن نے جس کی روح میں اپنے جد امجد کی بلند ہمتی کے ساتھ ساتھ مستقل مزاجی اور احتیاط کے جوہر کارفرما تھے،یہ قلعہ سر کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس نے 1888ء میں امرتسر سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور لاہور چلا آیا جہاں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج قائم ہوئے ابھی چند ہی برس گزرے تھے۔انٹرمیڈیٹ کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کرنے کے بعد اس نے 1890ء میں اس کالج میں داخلہ لے لیا۔خاندان کے بڑے بوڑھوں کی طرف سے اس کی مخالفت کی گئی ''عبدالرحمٰن! تم طبیب بنو گے؟'' وہ کہتے ''تمہارے خاندان میں کبھی ایسا نہیں ہوا''۔لیکن عبدالرحمٰن اپنے ارادے کا پکا اور دوراندیش تھا۔وہ ان زمینوں میں اپنی زندگی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا جو کنوؤں سے سینچی جاتی تھیں اور جن میں یافت کا انحصار موسم کی مہربانی پر تھا۔

اس نے اپنے اہل خاندان کو بتایا کہ انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں دوسروں سے زیادہ نمبر حاصل کرنے کی وجہ سے اسے کنگ ایڈورڈ کالج میں ایم بی بی ایس کی تعلیم کے 5 سالوں کے دوران سات روپے ماہوار وظیفہ ملے گا۔کفایت شعار اور سخت جان عبدالرحمٰن ان سات روپوں میں سے بھی تین روپے اپنے گھر بھیج دیتا اور چار روپے ماہوار میں گزر بسر کرتا۔مستقبل کے سہانے خوابوں کے سہارے زندگی بسر کرنے کے باوجود اس کا گھر بہن بھائیوں اور ماں باپ سے ملاقات کے لیے بے قرار ہو جاتا تو وہ اتوار کو صبح سویرے جستروال کی طرف روانہ ہو جاتا۔کئی گھنٹے پیدل چل کر وہ اس گھر میں پہنچتا جہاں کبھی اس کے اجداد حکمرانوں کی زندگی گزارتے تھے اور ان کے اصطبلوں میں سینکڑوں گھوڑے پالے جاتے تھے۔

1895ء کا سال عبدالرحمٰن کے لیے کامرانی کا سال تھا۔اس نے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کر لی تھی اور اب وہ ایک شہسوار کی طرح آمادہ سفر تھا۔پشاور میں جہاں ڈبگری کے ہسپتال میں ہیلتھ افسر کے طور پر اس کی پہلی تقرری عمل میں آئی،اگلے 29 سال اس کے لیے ایک کے بعد دوسری کامیابی لے کر آتے رہے۔محنتی اور منصوبہ ساز آدمی نے فارغ اوقات کے لیے ایک کلینک کھول لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی شہرت دور دور تک پھیلنے لگی۔اپنی کلف لگی پگڑی،لمبے شلوار کرتے،گورے چٹے رنگ اور متین چہرے کے ساتھ وہ ایک باوقار آدمی دکھائی دیتا تھا۔وہ تول تول کر بولنے اور سوچ سمجھ کر حرکت کرنے والا آدمی تھا۔اپنے مریضوں کے ساتھ وہ شفقت سے پیش آتا اور گردوپیش کے دیہات سے علاج کے لیے آنے والے گھبرائے ہوئے لوگوں کو تسلی و تشفی دیتا۔

اس شہر میں اس نے بڑی نیک نامی اور بہت روپیہ کمایا۔خاندان کی چھنی ہوئی امارت اور دبدبے کی خلش ہمیشہ اس کے دل میں رہی۔اسے ہمیشہ یہ احساس رہا کہ وہ ایک معزز خاندان کا فرد ہے۔اب اس کی شہرت شہر سے نکل کر دور دراز کے قصبات اور پھر وہاں سے افغانستان کے دارالحکومت کابل تا جا پہنچی تھی،جہاں امان اللہ خان 1919ء کی دوسری افغان جنگ جیت کر ایک ہیرو کی طرح سر پر آرائے سلطنت تھا۔

ایک روز ڈاکٹر عبدالرحمٰن کو امان اللہ خان کا پیغام ملا کہ وہ اس مشہور معالج سے ملاقات کے خواہش مند ہیں۔ جدید تعلیم کا دلدادہ اور نئے رجحانات کا افغان بادشاہ کابل کے بوڑھے طبیبوں کی بجائے پشاور کے ڈاکٹر سے علاج کرانے کا آرزومند تھا۔ اپنی سیاہ گاڑی میں طورخم کے راستے دن بھر کا طویل سفر طے کرکے ڈاکٹر عبدالرحمٰن کابل پہنچے اور انہیں بادشاہ کے محل میں لے جایا گیا۔

جب وہ چند دن کے بعد لوٹ کر آئے تو ان کی گاڑی خشک میووں سے بھری تھی اور انہوں نے اپنے اہل خاندان کو بتایا کہ اب وہ گاہے بہ گاہے بادشاہ سے ملنے کابل جایا کریں گے۔ امان اللہ خان کو شائستہ اور خوش اطوار آدمی پسند آیا تھا جو غیر ضروری گفتگو سے گریز کرتا تھا اور جس کا ہر مشورہ قابل عمل محسوس ہوتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں والے محتاط آدمی نے ڈبگری میں ایک باغ خریدا اس کا بچپن آزاد فضا میں گزرا تھا، اس کے اندر کا دہقان ابھی زندہ تھا۔ وہ پرندوں اور درختوں کے ساتھ ایک خاص مسرت محسوس کرتا تھا۔ اپنی عمر بھر کی کمائی سے اس نے 40 دکانوں پر مشتمل ایک مارکیٹ تعمیر کی۔ اپنی کمائی سے وہ آسودہ اور مطمئن تھا۔ حالات نے جو کچھ اس کے خاندان سے چھین لیا تھا، وہ سب کچھ اس نے اپنی محنت سے دوبارہ حاصل کر لیا تھا۔ عزت و توقیر، جائیداد، شہرت اور اثر و رسوخ ڈاکٹر عبدالرحمٰن کے گھر میں اب کیا نہیں تھا۔

لیکن آدمی ہمیشہ کے لیے اس دنیا میں کیسے آسودہ رہ سکتا ہے جسے خدا نے تنوع، کشمکش اور آزمائش میں پیدا کیا ہے۔ ایک روز ڈاکٹر عبدالرحمٰن کی بیوی اسے داغ مفارقت دے گئی اور اسے اپنا گھر اجڑا ہوا محسوس ہونے لگا۔ جستروال سے سینکڑوں میل دور پشاور میں یہ اس کا خاندان ہی تو تھا جس سے وہ اپنی شناخت کی تکمیل کرتا تھا۔

خاموش طبع آدمی کو چپ سی لگ گئی تھی اور وہ کھویا کھویا سا دکھائی دیتا تھا۔ دوستوں، رشتہ داروں اور جاننے والوں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ دوسری شادی کر لے۔ وہ ایک صحت مند آدمی تھا اور ابھی 50 سال کا بھی نہیں ہوا تھا لیکن وہ دوسری شادی کیسے کر لے۔ اس کی اولاد لاڈ پیار اور شفقت کی فضا میں پلی تھی۔ اس کا بڑا بیٹا فضل خان جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکا تھا۔ کون جانتا ہے کہ ڈبگری کی حویلی میں آنے والی نئی دلہن اپنی سوتیلی اولاد کے ساتھ کیا سلوک کرے گی۔

کئی سال گزر گئے اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن کی تنہائی گہری ہوتی چلی گئی۔ ان کا بیٹا اب قانون کی تعلیم کے لیے علیگڑھ جانے والا تھا اور بڑی بیٹیاں شادی کی عمر کو پہنچ گئی تھیں۔ کسی نے ڈاکٹر کو ایک معزز لیکن کم آسودہ ککے زئی خاندان کی ہاجرہ بیگم سے شادی کر لینے کا مشورہ دیا اور اسے سمجھایا کہ سوتیلا پن کوئی لازمی بیماری نہیں ہے۔ تنہا آدمی نے سارے معاملے پر احتیاط سے غور کیا اور آخر کار اس مشورے پر عمل کرنے کو تیار ہو گیا۔

آخر کار ہاجرہ ڈبگری کی حویلی میں دلہن بن کر آ گئی۔ تھوڑے ہی دنوں میں عبدالرحمٰن نے جو برصغیر میں ایم بی بی ایس کی ڈگری پانے والے اولین ڈاکٹروں میں سے ایک تھا یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ محض قرآن مجید پڑھی ہوئی یہ خاتون کیسی خوش سلیقہ اور سگھڑ واقع ہوئی ہے۔ ہاجرہ بیگم نے تیزی کے ساتھ اپنے آپ کو نئے حالات کے سانچے میں ڈھال لیا۔ اس نے بس اتنی تعلیم پائی تھی کہ وہ اخبار اور کتاب پڑھ سکتی تھی لیکن اسے خط لکھنے کے لیے اپنے سوتیلے بیٹے کی مدد درکار ہوتی تھی۔ جہاندیدہ آدمی کو اس بات سے بڑی مسرت ہوئی کہ ہاجرہ نے جس کے ہاں اب ایک بیٹی پیدا ہو چکی تھی اس کی پہلی اولاد سے اجنبیت کا برتاؤ نہیں کیا۔

کچھ دنوں کے بعد اس نے اپنی نئی دلہن کے ساتھ جستروال کا رخ کیا جہاں اس کے والد بلند خان کا انتقال ہو چکا تھا لیکن اس کے بہن بھائی وہاں موجود تھے اور اس نے ان سے ہمیشہ رابطہ استوار رکھا تھا۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن کو اس بات سے بڑی تسکین ہوئی کہ اس کے اہل خاندان نے ہاجرہ بیگم کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا، وہ ایک گھل مل جانے والی خاتون تھی، وہ نرمی اور احتیاط کے ساتھ بات کرتی تھی اور لوگ جلد ہی اس کی عزت کرنے

لگتے تھے۔

گیارہ جون 1924ء کو ڈبگری ہسپتال کے آفیسر وارڈ میں ہاجرہ بیگم کے ہاں ایک بیٹے نے جنم لیا۔ خاندان میں ایک عرصے کے بعد جنم لینے والے بچے کی پیدائش کا جشن منایا گیا۔ بڑی بیٹی سلطان کے بعد ہاجرہ بیگم کے ہاں پیدا ہونے والے اوپر تلے کئی بچے کم سنی میں انتقال کر گئے تھے، تاہم انگریز لیڈی ڈاکٹر مس ہیٹی نے جب ڈاکٹر عبدالرحمٰن کو دن کے دو بجے بیٹے کی پیدائش کی اطلاع دی تو انہیں یہ بھی بتایا کہ نومولود کی صحت بہت اچھی ہے۔

بچے کا نام اختر رکھا گیا۔ خاندان کی روایت کے مطابق اس کے لیے ایک آیا کا انتخاب کیا گیا۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن اب 59 سال کے ہو چکے تھے اس عمر میں بیٹے کی پیدائش پر وہ بے حد خوش تھے۔ وہ بچے کی صحت کے لیے متفکر رہتے اور ذرا سی گڑبڑ پر اپنے ساتھیوں سے صلاح مشورہ کرتے۔ ان میں ڈبگری ہسپتال میں کام کرنے والی انگریزی لیڈی ڈاکٹرز شامل تھیں۔

اختر شروع ہی سے ایک مختلف بچہ تھا۔ شاید اس کی انفرادیت کا ایک سبب وہ غیر معمولی توجہ بھی تھی جو اسے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے حاصل رہی وہ اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا اور بہنوں کا تنہا بھائی تھا۔ چونکہ ہاجرہ بیگم کے دو بیٹے حمید اللہ اور محمد افضل کم سنی میں انتقال کر چکے تھے، لہٰذا اس کے لیے صفائی کا بڑا اہتمام کیا جاتا اور اس کی صحت کا خاص طور سے خیال رکھا جاتا اگر اسے چھینک بھی آ جاتی یا ذرا سی حرارت ہو جاتی تو گھر میں سراسیمگی پھیل جاتی۔ فاطمہ، اختر کی افغان آیا کو سختی سے ہدایات پر عمل کرنے کو کہا گیا تھا۔ اسے یہ احساس دلانے کو کوشش کی گئی کہ وہ ایک بہت اہم ذمہ داری نبھا رہی ہے۔ اس نیک دل عورت نے جو بچے کے کمرے میں پشتو کی لوریاں گاتی سنائی دیتی تھی، اپنے اس کردار کو خوشدلی سے قبول کر لیا۔ وہ ان نادر و نایاب عورتوں میں سے ایک تھی جو ہر بچے کے لیے ممتا کا جذبہ محسوس کرتی ہیں اور جو فرائض کی بہتر انجام دہی پر مسرت کے انعام سے بہرہ ور کی جاتی ہیں۔ اس خاتون نے لمبی عمر پائی۔ جب قیام پاکستان کے بعد اس نے اختر کو پشاور میں دیکھا جہاں وہ اپنے بچپن کی یادیں تازہ کرنے کے گیا تھا تو اس نے نوجوان لڑکے کو چوما اور وفور جذبات سے اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

لاڈلے بچے پر سختی نہیں کی جا سکتی تھی، لیکن بچوں کی تربیت کو اہمیت دینے والے والدین اسے بگاڑنے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتے تھے۔ لہٰذا رفتہ رفتہ ان کے درمیان ایک عجیب سا تعلق ابھر آیا۔ وہ اسے ہر بات تفصیل سے سمجھاتے اور ہمیشہ کہتے کہ ایک اچھے بچے کو کوئی بری حرکت نہیں کرنی چاہیے۔ بہت سے آنکھیں اس بچے پر نگران تھیں۔ رفتہ رفتہ اس کے اندر یہ احساس پروان چڑھنے لگا کہ اسے ہر ناز یبا چیز سے گریز کرنا چاہیے۔

اختر کی عمر اس وقت چار سال تھی جب اس کے جواں سال سوتیلے بھائی فضل خان کی موت کا سانحہ پیش آیا اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن کی کمر ٹوٹ گئی۔ فضل خان نے علی گڑھ یونیورسٹی سے قانون کی تعلیم حاصل کی تھی اور ابھی چند ہی ماہ پہلے اس شہر میں پریکٹس کا آغاز کیا تھا، جہاں بہت سے لوگ اس کے باپ کو جانتے اور اس کے خاندان کی عزت کرتے تھے۔ یہ سرما کے دن تھے جب اسے ایک مقدمے کے سلسلے میں چند میل دور نوشہرہ جانا پڑا۔ فضل خان ایڈووکیٹ اپنے گھر سے نکلا تو مطلع صاف تھا لیکن جب وہ نوشہرہ پہنچا تو اسے بارش نے آ لیا، سرد ہوا چلنے لگی اور ٹھنڈ میں اضافہ ہو گیا لیکن نوجوان وکیل نے اس کی زیادہ پرواہ نہیں کی۔ وہ گھر پہنچا تو بخار میں مبتلا تھا۔ اس کا علاج کیا گیا لیکن بخار بگڑ گیا تب اسے ہسپتال منتقل کر دیا گیا۔ وہ دوہرے نمونیہ میں مبتلا تھا ڈبگری کے ہسپتال میں ڈاکٹروں نے اپنے بزرگ ساتھی کے فرزند کو بچانے کی سرتوڑ کوششیں کیں لیکن سناؤنی آ گئی تھی۔

بیٹے کی سانس ٹوٹی تو باپ کا دل بھی مرجھا گیا۔ اس کے کئی کم سن بچے موت کی گود میں چلے گئے تھے لیکن تناور بیٹے کی موت نے اس کا دل توڑ ڈالا، جسے اب اس کے بڑھاپے میں رفتہ رفتہ گھر کا نظام سنبھالنا تھا۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن کے چہرے پر اب پہلی سی تازگی کی جگہ افسردگی نے لے لی۔ وہ ضرورت ہی کے وقت بات کرتے، بیٹھے بیٹھے کھو سے جاتے اور خلا میں گھورنے لگتے۔ کمرے کی تنہائی میں ان کی آنکھیں بھر آتیں اور وہ حیرت و حسرت کے

ساتھ سوچتے کہ کیا یہی وہ زندگی ہے جس کے لیے وہ عمر بھر بھاگ دوڑ کرتے رہے تھے۔ان کی جواں سال اہلیہ انہیں تسلی دینے کی کوشش کرتیں لیکن کوئی چیز اان کی بے قراری کم نہ کر سکی تا آنکہ جدائی کا دن آ پہنچا۔ بیٹے کی موت کو چھ ماہ گزرے تھے کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن کو دل کا دورہ پڑا اور وہ آناً فاناً دنیا سے رخصت ہو گئے۔ایک بھرپور زندگی چپ چاپ موت کی آغوش میں چلی گئی۔ جو ازل سے آدمی کے تعاقب میں ہے، جو بے بسی کا احساس جگانے، دہشت زادہ اور تنہا کرنے کے لیے آتی ہے اور جو یاد دلاتی ہے کہ اس دنیا میں کسی کو دائمی طور پر نہیں رہنا، سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے اور اسی طرف لوٹ جانا ہے۔

ڈاکٹر کے جنازے پر سارا شہر امڈ پڑا، ہزار ہا آنکھوں سے اشک بہے اور ان گنت پرسا دینے والے آئے لیکن پھر صحن میں ایسا سناٹا طاری ہوا کہ ہاجرہ بیگم ڈر گئیں کہ اب اس اجاڑ گھر میں وہ کیسے رہیں۔ وہ پلٹ کر اپنے بیٹے کی طرف دیکھتیں اور جیسے کوئی ان کا دل مٹھی میں جکڑ لیتا۔ ساڑھے چار سال کا ننھا اختر باپ کی موت پر تڑپ تڑپ کر رویا اور رو رو کر چیخا تھا۔ جنازہ اٹھایا جانے لگا، تو وہ ابا کے قدموں سے لپٹ گیا۔ ''میرے ابا کو مت لے جاؤ'' اس نے روتے ہوئے اصرار کیا۔

ڈبگری کا باغ، گھر اور 40 دکانوں کی مارکیٹ کل تک جو وجہ افتخار تھا، اب بوجھ دکھائی دینے لگا، بیٹا مر گیا حلیم الطبع اور سرفراز شوہر خدا کے پاس چلا گیا۔اس کی (پہلی بیوی سے) جوان بیٹیاں گھروں کو سدھاریں، اب ہاجرہ گھر میں اکیلی تھیں، دو کم سن بیٹیاں ایک بیٹا اور پہاڑ سی جوانی۔ رائج الوقت قانون کے مطابق حکومت نے جائیداد کو اپنی تحویل میں لے لیا کہ نگہبانی کے لیے کوئی مرد موجود نہ تھا۔ ہاجرہ بیگم کے رشتہ کے ایک بھائی کو گارڈین مقرر کر دیا گیا اور خاندان کے لیے گزارہ الاؤنس کا تعین ہو گیا۔ ہاجرہ کے لیے اب پشاور میں کیا رکھا تھا۔ انہوں نے بچوں کو سینے سے لگایا، سامان سمیٹا اور شوہر کی یاددل میں بسائے جستر وال چلی گئیں۔ ضلع امرتسر کی تحصیل اجنالہ میں، دریائے راوی سے پانچ میل ادھر، اس حویلی میں جو ڈاکٹر عبدالرحمٰن کے دادا بلند خان نے تعمیر کی تھی اور جس میں آج بھی ان کی اولاد گئے دنوں کی حسرت مگر حکمران تیوروں کے ساتھ آباد تھی۔

چھوٹی اینٹوں کی بلند و بالا حویلی چار گھروں میں منقسم تھی۔ ان گھروں میں سرور خان، کریم داد خان، عنایت اللہ خان، سعد اللہ خان اور بلند خان کی دوسری اولاد مقیم تھی۔ درمیان میں ایک بڑا صحن اور ایک قطار میں چار باورچی خانے، ہر خاندان کے پاس دو بڑے کمرے تھے۔ اناج ذخیرہ کرنے کے لیے چھتوں پر مٹی کے چھوٹ کمرے الگ سے بنائے گئے تھے۔ رہائشی کمروں میں کپڑے کی جھالروں والے سقفی پردے لگے تھے۔ گھروں میں کم عمر ملازم لڑکیاں مختلف خدمات انجام دیتیں، نگرانی کے لیے بڑی عمر کی خواتین بھی رکھی جاتیں لیکن کوئی مرد ملازم نہ تھا کہ اس زمانے کے شریف مسلمان گھرانوں میں اس کا تصور تک نہ تھا۔

یلی میں نرم گفتار اور سلیقہ مند بہو کا خیر مقدم ہمدردی اور محبت سے کیا گیا اور اس کے لیے دو کمرے خالی کر دیے گئے۔ تھوڑے ہی دنوں میں ہاجرہ بیگم کو اندازہ ہونے لگا کہ شوہر کے بغیر رشتہ داروں میں زندگی بسر کرنے کے لیے کس صبر اور احتیاط کی ضرورت ہے۔ وہ مضبوط اعصاب کی ایک سلیقہ مند اور محتاط خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنے کان اور آنکھیں کھلی رکھیں اور زبان کو دل کی طرح سنبھال لیا۔ بے تکے مشوروں اور غیر ضروری تبصروں کے درمیان انہوں نے اپنی ساری توجہ اولاد پر مرکوز کر دی۔ جیسے کوئی پرندہ آفت کے اندیشے سے اپنے بچوں کو پروں تلے سمیٹ لیتا ہے۔

پشاور کے برعکس جہاں دربان ان کے دروازے پر کھڑے رہتے تھے، جستر وال کے ابتدائی دن بہت تکلیف دہ تھے۔ اونچی چھتوں والی حویلی میں شام اترتی تو ہاجرہ بی بی کا دل ڈوبنے لگتا۔ وہ اپنے بچوں کو سمیٹ کر بیٹھ جاتیں اور گزری ہوئی آسودہ، آسان اور مہربان زندگی کی یادیں چاروں اور محیط ہو جاتی۔ کبھی کبھی تو حسرت اور محرومی کے احساس کی شدت اور اندیشوں کے خوف سے آنسو ضبط کرنے کی کوشش ناکام ہو جاتی اور بے اختیار رو

پڑتیں۔ بے بس ماں کو اشک بار پا کر بچے بھی رونے لگتے اور گھر کے در و دیوار سسکیوں سے گونج اٹھتے۔ بے بسی کی انہی راتوں میں پاک باز اور پرعزم ہاجرہ نے ایک خواب دیکھا۔

جیسا کہ وہ بعد میں بتایا کرتی تھیں، انہوں نے خود سے سوال کیا کہ نجات کا راستہ کہاں ہے؟ اس سوال پر دنوں اور ہفتوں کے غور و فکر کے بعد انہوں نے دو نہایت اہم فیصلے کیے جس نے ان کی آئندہ زندگی اور ان کی اولاد کو ثمر بار کر دیا۔ وہ ہمیشہ سے مذہبی واقع ہوئی تھیں لیکن اب انہوں نے اپنے خدا سے گہرا تعلق استوار کر لیا کہ اس کے سوا ان کا کوئی حقیقی سہارا نہ تھا۔ اس احساس نے کہ ان پر کتنی گہری ذمہ داری آ پڑی ہے جواں سال خاتون کو قبلہ رو کر دیا۔ وہ تہجد کے وقت اٹھ بیٹھتیں اور خدا سے مدد کی طالب ہوتیں جو نماز اور صبر سے مدد مانگنے والوں کو استقامت اور عظمت عطا کرتا ہے۔ دنوں اور ہفتوں میں گرد و پیش نے ایک گھریلو خاتون کو یکسر بدلتے اور ایک نئی شخصیت میں ڈھلتے دیکھا۔ ثانیاً انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ حالات کا مردانہ وار مقابلہ کریں گی۔ اپنے کامران شوہر کی محبت میں ان پر یہ راز آشکار ہو چکا تھا کہ تعلیم ہی عظمت، کامیابی اور عزت کی شاہ کلید ہے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلانے اور اس کے لیے ہر مشکل کا سامنا کرنے کا فیصلہ کیا۔

معلوم نہیں ایک سخت تربیت کا تصور انہیں صرف اپنے ماں باپ سے ملا تھا یا اس میں ان کے شوہر کا دخل بھی تھا۔ دیکھا گیا کہ وہ اپنے بیٹے کی اس سختی اور اہتمام سے تربیت کر رہی ہیں جیسے اس یتیم شہزادے کی، جسے وقت آنے پر ایک سلطنت سنبھالنی ہو۔ پشاور میں اختر ایک انگریزی سکول میں پڑھتا تھا اور اس کی رسم بسم اللہ اس اہتمام سے ہوئی تھی کہ خاکسار تحریک کے بانی علامہ عنایت اللہ خان المشرقی خاص طور پر اپنے دوست کے گھر آئے تھے۔ جستر وال کے گاؤں میں تعلیم کا کوئی خصوصی انتظام کیونکر ممکن ہوتا۔ ہاجرہ بی بی نے اپنے رشتے کے بھائی ماسٹر عبدالرحیم سے جو قصبے کے سرکاری پرائمری سکول میں مدرس تھے، اس بارے میں مشورہ کیا۔ لاولد عبدالرحیم خان کو ننھے اختر سے بہت دلچسپی تھی اور وہ اکثر اسے دیکھنے آیا کرتے تھے: ''بھلا اس میں کیا مشکل ہے؟''

عبدالرحیم نے کہا ''اختر کو دوسرے بچوں کے ساتھ سرکاری سکول میں پڑھنا چاہیے'' اور وہ اگلے روز اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ اختر نے ٹاٹ پر بیٹھے آموختہ دہراتے بچوں کو حیرت سے دیکھا اور کلاس روم میں بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا وہ کرسی پر بیٹھ کر پڑھے گا اور اس کے سامنے ایک ڈیسک ہونی چاہیے جیسا کہ پشاور والے سکول میں تھا۔

اختر کی ماں اور عبدالرحیم خان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی ضد پر اڑا رہا کہ وہ پڑھے گا تو کرسی پر بیٹھ کر ورنہ سکول ہی نہیں جائے گا۔ وہ پانچ سال کا ہونے کو آیا تھا اور اب وقت ضائع نہیں کیا جا سکتا تھا پھر اس مسئلے کا کیا حل تلاش کیا جائے۔ اسے ٹاٹ پر بیٹھ کر پڑھنے کو کہا جاتا تو وہ رونے لگتا۔ ''میری نیکر گندی ہو جائے گی' وہ کہتا ''میرے کپڑوں کو مٹی لگ جائے گی۔'' عبدالرحیم خان ہیڈ ماسٹر کے پاس گئے اور ان سے اپنے یتیم بھانجے کا مسئلہ بیان کیا۔ انہوں نے درخواست کی کہ ضدی بچے کے لیے کمرے میں میز کرسی رکھنے کی اجازت دی جائے۔

عبدالرحیم ایک سکول ماسٹر تھے لیکن آخر وہ جستر وال کے معزز پٹھان خاندان کے فرزند بھی تھے، وہ آئے روز درخواست کرنے والے آدمی نہیں تھے اور پھر یہ ایک یتیم بچے کا مسئلہ تھا۔ ہیڈ ماسٹر نے ان کی بات مان لی۔ اگلے روز کمرے میں ایک ننھی سی کرسی اور میز سجا دی گئی۔ یتیم شہزادے کی تعلیم کا آغاز ہو گیا۔ یہ 1929ء کا موسم خزاں تھا جستر وال میں شیشم کے درختوں پر پتے پیلے ہونے لگے تھے۔ اختر سکول سے لوٹتا تو ماں کو منتظر پاتا۔ گھر میں اس کی پسند کا کھانا پکایا جاتا۔ اس سے کرید کرید کر پوچھا جاتا کہ مدرسے میں اس کا دن کیسے گزرا۔ اسے یاد دلایا جاتا کہ اسے گالیاں بکنے اور سبق یاد نہ کرنے والے بچوں سے دور رہنا چاہیے۔ اختر اپنی ماں کے سوالوں کا جواب دیتا لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ طویل گفتگو سے گریز کرتا۔ وہ کہانیاں

نہیں سنا تا تھا اور اتنی ہی بات کہتا، جس قدر ضروری ہوتی۔ اس میں یہ احتیاط کہاں سے آ گئی؟ ہاجرہ بی بی کی تسلی نہ ہوتی۔ ماسٹر عبدالرحیم خان ملنے آتے تو وہ ان سے پوچھتیں۔ وہ اپنی بیوہ بہن کو اطمینان دلانے کی کوشش کرتے، جس نے مستقبل کی ساری امیدیں کمسن بیٹے سے وابستہ کر لی تھیں۔ لیکن ایسا لگتا کہ وہ مطمئن نہیں ہو پا رہیں۔ ایک بار جب وہ بار بار یہ سوال دہرا رہی تھیں کہ کیا واقعی اختر کا دل سکول میں لگ گیا ہے؟۔ انہوں نے ہنستے ہوئے جواب دیا: میرے کہنے سے تو آپ کی تسلی ہو گی نہیں، کچھ دن اور ٹھہر جائیں، امتحان کا نتیجہ نکلے گا تو آپ کو اپنے سوال کا جواب مل جائے گا۔

ماں کے دل کو قرار کہاں تھا۔ بچے کو گھر میں آموختہ یاد کرانے والا کوئی نہ تھا اور بھائی سے اس کی درخواست کرنا معیوب لگتا تھا۔ آخر وہ اپنی بہن سے معاوضہ کیسے وصول کر سکتے تھے اور معاوضہ ادا کیے بغیر ایک ذمہ داری سونپنا روا نہ تھا۔ آخر کار ایک اور استاد کا انتخاب کیا گیا، جو ہر روز گھر آ کر پڑھایا کرتا۔ ننھے اختر کو اپنا یہ استاد عمر بھر یاد رہا۔ یہ درست ہے کہ اسے معاوضہ ادا کیا جاتا تھا لیکن وہ جس انہماک اور محبت سے تعلیم دیتا اور جس شفقت سے پیش آتا تھا، اس کا معاوضہ کون ادا کر سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ اختر پڑھائی میں چمکنے لگا۔ چند ماہ بعد سکول میں امتحانات منعقد ہوئے اور پہلی جماعت کا نتیجہ نکلا تو معلوم ہوا کہ اختر اپنی کلاس میں اول رہا ہے، ہاجرہ بی بی فرط مسرت سے بہنے والے آنسو پونچھتی اور مٹھائی بانٹتی رہیں، پودے پر پہلی کونپل پھوٹ آئی تھی۔ باہر گندم کے کھلیانوں میں سونے کے ڈھیر پڑے تھے، راوی کے کنارے مہربان ہوائیں بہہ رہی تھیں، جستر وال میں یہ بہار کا موسم تھا۔

اب اختر کی پڑھائی میں اور بھی اہتمام کیا جانے لگا۔ ماسٹر جی سے کہا گیا کہ وہ کچھ زیادہ وقت دیا کریں، چنانچہ وہ سہ پہر کے وقت آتے اور شام تک پڑھایا کرتے۔ پڑھائی کا یہ سلسلہ چھٹی کے دنوں میں بھی جاری رہتا اور کبھی کبھی تو شام چھا جانے کے بعد بھی جب حویلی گیس کی روشنی سے منور ہوتی۔ گرما کی شاموں اور چاندنی راتوں میں جب اختر کے ہم عمر ''لکن میٹی'' کھیلنے کی تیاریاں کر رہے ہوتے، وہ کتاب سے جڑا ہوتا۔ پنجاب کے سب دیہات کی طرح جب شام پڑے بچے ایک سرخوشی اور بے تابی کے ساتھ ہم جولیوں کو جمع کرنے لگتے تو کبھی کبھار ان کی ایک ٹولی اختر کے گھر کے سامنے روایتی انداز میں گائے جانے والے بول دہراتی ۔

ٹھیکری وے ٹھیکری، ٹھیکری ساڈے کول
سارے بچے کھیڈ دے، اختر ماں دے کول

یہ گویا ایک طعنہ تھا کہ ارے میاں یہ کھیل کود کا وقت ہے اور تو ماں کے پاس گھسا بیٹھا ہے۔ ماں کی خوشنودی کا طالب کمسن بچہ ضبط کیے بیٹھا رہتا لیکن ہمیشہ نہیں، کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ اس کا جی گھر سے بھاگ نکلنے اور آنکھ مچولی کھیلنے کے لیے بے قرار ہو جاتا، لیکن اماں کھیل کے مقررہ وقت کے سوا کبھی اس کی اجازت نہیں دیتی تھیں اور باہر ہمجولی شور مچا رہے ہوتے۔ ''اختر ماں دے کول''۔ اختر بے قرار ہو کر رو پڑتا۔ کوئی دوسری ماں ہوتی تو اس کا دل پگھل جاتا لیکن ہاجرہ بی بی نے جیسے دل پر پتھر رکھ لیا تھا۔ معلوم نہیں کس نے ان کے کان میں راز کی بات کہہ دی تھی کہ دور کی منزل کے مسافر کو کبھی پلٹ کر نہیں دیکھنا چاہیے اور کامیابی ان کے لیے ہے، جو ہدف پر نگاہ رکھتے ہیں۔ وہ بچے کے ہاتھوں سے کتاب لے لیتیں اور اسے کوئی اچھا سا شعر سناتیں یا کوئی حکایت۔ اکثر ایک شعر پڑھتیں اور اپنی سادہ زبان میں اختر کو اس کا مطلب سمجھانے کی کوشش کرتیں ۔

تندیِ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

اختر کے لیے اس کا زمانہ طالب علمی دوسروں سے مختلف تھا۔ اسے یہ باور کرایا جاتا تھا کہ وہ دوسرے بچوں کی طرح نہیں۔ اسے گالی دینے، شرارت کرنے اور وقت ضائع کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ اپنی ماں کی آنکھوں کے سائے تلے جو اس کے پل پل کی خبر رکھنے کی کوشش کرتی تھیں، وہ بتدریج ا

یک سانچے میں ڈھل گیا۔ رفتہ رفتہ اس کی شخصیت کا ایک اسلوب بن گیا اور وہ عمر بھر اس اسلوب کے ساتھ زندہ رہا۔ محنت، احتیاط، توازن، شائستگی، ذاتی کامیابیوں کے لیے مسلسل جدوجہد اور چیلنج قبول کرنے کی صلاحیت اس شخص کے بنیادی عوامل تھے۔ بلوغت کی عمر میں اپنی قوم اور وطن سے محبت کا جذبہ بھی اس شخصیت کا ایک اٹوٹ حصہ بن گیا۔ جنرل اختر کو عمر بھر اس بات کا احساس رہا کہ وہ جو کچھ بھی ہیں، اپنی ماں کی بدولت ہیں۔ اولاد کو اپنی ماں سے محبت ہوتی ہے لیکن جہاں تک اس آدمی کا تعلق ہے، اس کے لیے ان کی والدہ اس کی شخصیت کا ایک حصہ تھی، جسے وہ اور ان کے بہن بھائی پڑوس میں آباد دلی کے ایک گھرانے کے زیر اثر بواجی کہنے لگے تھے اور رفتہ رفتہ یہ ان کا جگت نام ہو گیا۔

بواجی تہجد کے وقت اٹھ بیٹھتیں اور جیسا کہ سحر دم بیدار ہونے والوں کا مزاج ہوتا ہے کچھ ہی دیر بعد وہ اپنے تینوں بچوں کو بھی جگا دیتیں۔ اختر کی بڑی بہن آپا سلطان جو اب بھی بقید حیات ہیں، ناشتہ تیار کرنے لگتیں اور اختر کو آموختہ یاد کرنے کے لیے کہا جاتا۔ عجیب بات یہ ہے کہ وہ رات کو بھی عام بچوں کے برعکس دیر سے سویا کرتا تھا جب وہ سبق یاد کر رہا ہوتا اور بواجی اس کے قریب کرسی، چارپائی یا مصلے پر بیٹھی رہتیں۔

جستروال کے پرائمری سکول سے چوتھی جماعت کا امتحان پاس کرنے کے بعد اختر کو چھ سات میل دور اجنالہ کے ہائی سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ خاندان کی بڑی بوڑھیوں کو اب تک یاد ہے کہ اجلے لباس کا ذوق رکھنے والے لڑکے کو اینٹوں کی سڑکوں پر دوڑتے تانگوں سے بڑی وحشت ہوتی تھی۔ پہلی بار اجنالہ لے جانے کے لیے اسے تانگے پر بٹھایا گیا تو وہ خوف کے مارے چلانے لگا۔ ماں کا خیال تھا کہ وہ بتدریج اس کا عادی ہو جائے گا لیکن وہ نہ ہو سکا۔ اب اس مسئلے کا کیا حل تلاش کیا جائے؟ ٹھنڈے دل سے سوچ بچار کرنے والی بواجی نے آخر کار ایک حل ڈھونڈ نکالا۔ اختر کے لیے ایک سائیکل خریدی گئی لیکن نو سالہ بچے کو روزانہ چھ میل کی مسافت کے لیے تنہا بھیجنا مشکل تھا، چنانچہ اس کے لیے ایک ملازم رکھا گیا۔ اگرچہ اب خاندان کے پاس پہلے سے وسائل نہیں تھے لیکن مرحوم ڈاکٹر عبدالرحمٰن اتنا روپیہ ضرور چھوڑ گئے تھے کہ بنیادی ضرورتیں سہولت سے پوری کی جا سکتیں، سالانہ گزارہ الاؤنس اس کے علاوہ تھا۔

اختر بہت باقاعدگی سے سکول جاتا اور اگرچہ اب بواجی براہ راست اس کی نگرانی نہیں کر سکتی تھیں لیکن وہ ملازم کے ذریعے خبر رکھنے کی کوشش کرتیں۔ گھر پہ ٹیوشن کا سلسلہ جاری تھا۔ رفتہ رفتہ وہ نظم کا خاصا پابند ہو گیا اور عام دیہاتی بچوں کے برعکس اپنی پسند پر کم ہی اصرار کرتا۔ صحت مند لڑکا کسی اور کھیل میں توجہ نہ لگا سکا لیکن جلد ہی اسے کشتی کے شوق نے آ لیا، جو اس زمانے کے برصغیر کا سب سے نمایاں کھیل تھا۔ وہ پیدائشی طور پر ایک صحت مند بچہ تھا اور اس کی خوراک کا خیال رکھا جاتا تھا وہ اس کھیل میں جلد ہی پہلے تو اپنے محلے اور پھر گاؤں بھر میں ممتاز ہو گیا۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے سے پہلے وہ گاؤں میں اپنی عمر کے بیشتر ''پہلوانوں'' کو پچھاڑ چکا تھا۔

جیسا کہ دیہاتی ماحول میں عام طور پر ہوتا ہے اس نے اپنے بہت سے حسد کرنے والے پیدا کر لیے تھے۔ وہ کم آمیز، خوش لباس اور طاقتور لڑکے کو ناپسند کرتے تھے جو کھیتوں سے تربوز اور باغوں سے پھل چرانے میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا اور جو ہر کام کرنے سے پہلے اس سوال پر غور کرتا تھا کہ اس کی پیاری بواجی یہ پسند کریں گی یا نہیں۔ اس کے ایسے ہی ناراض ہمجولیوں نے ایک بار لڑکے کو تھوڑا سا سبق سکھانے کا اور اس کے پندار کو شکست دینے کا منصوبہ بنایا۔ انہوں نے ایک پیشہ ور پہلوان سے ساز باز کی کہ وہ اختر کی ایک آدھ ہڈی توڑ ڈالے۔ انہوں نے اپنے ساتھی کے سامنے اس پہلوان کو اپنے جیسے کشتی کے ایک عام سے شوقین کے طور پر پیش کیا اور امید دلائی کہ وہ اسے آسانی سے شکست سے دوچار کر دے گا۔ وہ دونوں اکھاڑے میں اترے تو اختر کو اندازہ ہوا کہ معاملہ کڈھب ہے۔ اس نے بچنے کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن مدمقابل نے اس کا گھٹنا اپنی جگہ سے ہلا دیا کہ پہلوانوں کو اس کی بڑی مہارت ہوتی ہے۔ ہم عمروں کے چہروں پر تمسخر آمیز ہنسی کے درمیان وہ ہلے ہوئے ٹخنے کے ساتھ گھر پہنچا اور کچھ کھائے پیے

بغیر بستر پر دراز ہوگیا۔ اس کمال ضبط کے ساتھ جواب اس کی شخصیت کا خاصا ہو چکا تھا، اس نے درد کی شکایت نہیں کی۔ اسے اپنی ماں کا خیال تھا جو اس کی چھوٹی چھوٹی تکلیف پر تڑپ اٹھتی تھیں اور کرید کرید کر تفصیلات پوچھتی تھیں۔

آدھی رات کو ماں کی آنکھ کھلی، جواب بھی بیٹے کو ساتھ سلایا کرتی تھیں۔ انہوں نے لڑکے کے جسم کو بخار سے جھلستے پایا جیسا کہ بعد میں وہ اپنے پوتوں کو بتایا کرتی تھیں وہ بے قرار ہو کر رونے لگیں۔ پوچھ گچھ کے جواب میں بیٹے نے تفصیل بیان کی۔ معائنے سے معلوم ہوا کہ گھٹنے پر خاصی سخت چوٹ آئی ہے اور یہی بخار کا سبب ہے۔

بواجی نے بڑھاپے میں زیادہ تر وقت اپنی بڑی بیٹی آپا سلطان کے ساتھ گزارا جن سے وہ سارا دن بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرتیں یا عبادت میں محو ہوتیں۔ انہوں نے 89 سال کی عمر پائی اور 1982ء میں دل کے دورے سے انتقال کیا۔ جب کبھی وہ چند دن یا چند ہفتے قیام کے لیے اپنے بیٹے کے ہاں آتیں تو وہ اپنے پوتوں کو کچھ اور کہانیاں بھی سنایا کرتی تھیں۔

اختر اس وقت چھٹی یا ساتویں جماعت کا طالب علم تھا، سالانہ امتحان کا نتیجہ نکلنے والا تھا۔ بواجی دن چڑھے دہلیز کے قریب چارپائی بچھا کر بیٹھ رہیں اور بیٹے کا انتظار کرنے لگیں۔ کچھ دیر گزری تھی کہ حویلی کا ایک دوسرا بچہ نمودار ہوا جو جنالہ کے اسی سکول کا طالب علم تھا۔ جھجھکتے ہوئے اس نے بتایا کہ وہ تو امتحان میں پاس ہو گیا ہے لیکن اختر نہیں۔ ماں کے لیے یہ خبر بڑی ہی غیر متوقع تھی۔ انہیں اس سے بڑا صدمہ پہنچا اور وہ غصے سے بھر گئیں۔ کیا گھر پر ٹیوشن پڑھانے، راتوں کو جاگنے، دن بھر تلقین کرنے اور سحر دم بیدار ہونے کا یہی نتیجہ نکلنا چاہیے تھا؟ انہیں اپنے خوابوں کا محل زمیں بوس ہوتا دکھائی دیا۔ تو یہ ہے وہ لڑکا جس سے انہوں نے چھپ چھپ کر باتیں بنانے والے رشتہ داروں کے درمیان مستقبل کی ساری امیدیں باندھ رکھی ہیں۔ یہ ہے سارے لاڈ پیار اور اہتمام کا نتیجہ۔؟

ماں کی برہمی سے بے خبر اختر گھر میں داخل ہوا تو بوا نے اس پر ڈنڈوں کی بارش کر دی۔ اسے سنبھلنے اور بات کرنے کا موقع نہیں ملا اور وہ خاصی دیر پٹتا رہا تا آنکہ وہ نڈھال ہو کر بیٹھ گئیں اور اپنی قسمت کو کوستے ہوئے رونے لگیں اختر حیران اور آزردہ تھا۔ یہ درست ہے کہ بواجی پہلے بھی کبھی کبھار سختی سے کام لیا کرتی تھیں لیکن اس سے پہلے تو انہوں نے کبھی اسے ایسی بے دردی سے نہیں پیٹا تھا آج انہیں کیا ہو گیا تھا وہ ہمت سے کام لے کر آگے بڑھا اور ساری جرأت جمع کر کے آخر کار اس نے پوچھ ہی لیا کہ ایسا کیوں ہوا ہے اور اب وہ رو کیوں رہی ہیں۔ وہ کچھ دیر تو ناراض اور گم سم بیٹھی رہیں اور پھر انہوں نے چیخ کر کہا ''تمہیں یہ سوال کرتے ہوئے شرم نہیں آتی، امتحان میں فیل ہو کر گھر پہنچے ہو اور پوچھتے ہو کہ تمہاری پٹائی کیوں کی گئی ہے۔ پوچھتے ہو کہ میں رو کیوں رہی ہو؟'' حیرت اور لڑکپن کی اس معصومیت کے ساتھ جو عمر بھر اختر کے ساتھی رہی، اس نے اپنی ماں کو بتایا کہ وہ تو بہت اچھے نمبر لے کر پاس ہو گیا ہے اور فیل تو دراصل غلط اطلاع دینے والا ہم جولی ہوا ہے۔ بواجی جب بھی یہ کہانی سناتیں تو ان کا درد تازہ ہو جاتا اور وہ رونے لگتیں۔ وہ رات انہیں ہمیشہ یاد رہی جب وہ روئی کے پھاہے گرم کر کے بیٹے کے زخموں کو ٹکور کرتی رہی تھیں۔ عمر بھر وہ اس زیادتی کے لیے اپنے آپ کو معاف نہ کر سکیں۔

پیچھے رہ جانے والے رشتہ داروں، حویلی کے مکینوں اور دوسرے دیہاتی ہمسایوں کی جہل اور حسد سے پھوٹنے والی چھوٹی چھوٹی سازشوں سے اختر کا دل بہت کڑھتا تھا کہ ان واقعات سے ان کی ماں آزردہ ہوتیں اور اس کی چھوٹی سی دنیا میں اضطراب پھیل جاتا۔ بواجی کی حکمت عملی یہ تھی کہ رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے ساتھ بگاڑ پیدا کرنے سے گریز کیا جائے۔ شوہر کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا اور وہ مردوں کی حاکمیت کے دیہی ماحول میں اپنے یتیم بچوں کے لیے مسائل پیدا کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ ان کی سوجھ بوجھ یہ کہتی تھی کہ اگر وہ دوسری عورتوں کی طرح بچوں کے لیے دوسروں سے لڑنے بیٹھ

جائیں تو وہ ایک بے نتیجہ اور بھدی کشمکش میں الجھ جائیں گی۔ اس سے ان کے گھر کا سکون تو برباد ہوگا ہی، وہ اپنی اولاد کی تعلیم اور تربیت پر توجہ نہ دے سکیں گی، لہٰذا ہر ناگوار واقعہ پر ان کا عمومی ردعمل یہ ہوتا کہ وہ صبر اور ضبط سے کام لینے کی کوشش کرتیں۔ وہ ایک باحوصلہ خاتون تھیں اور آسانی سے مرعوب اور پریشان نہیں ہوتیں تھیں لیکن حالات کا تقاضا یہی تھا۔ اس ماحول میں پرورش پانے والے اختر میں دو رویے پروان چڑھے ایک تو یہ کہ وہ غیر ضروری مراسم سے گریز برتنے والے آدمی بن گئے۔ ان کے اندر یہ احساس پیدا ہوگیا کہ لوگ غیر ضروری طور پر مسائل پیدا کرتے اور خواہ مخواہ الجھتے رہتے ہیں، لہٰذا دوسروں کو اپنے معاملات میں مداخلت کا کم از کم موقع فراہم کیا جانا چاہیے اور اسی طرح دوسروں کے ذاتی معاملات سے دور رہنا چاہیے۔ کبھی بعد میں بھی وہ اپنے قریبی رشتہ داروں سے بھی بہت گھل مل کر نہ رہ سکے۔ وہ لوگوں کی بات توجہ سے سنتے تھے اور بعض اوقات مشکلات میں عزیزوں کی مدد کرنے کے لیے بہت دور تک چلے جاتے تھے لیکن تعلقات اور رشتوں کی خاص بے تکلفی ان میں کبھی پیدا نہ ہوسکی۔ ثانیاً وہ عمر بھر کے لیے اپنے خاندان کے ہو کر رہ گئے۔ شادی سے پہلے اور اس کے بعد ان کا سارا فارغ وقت ہمیشہ گھر پر گزرتا رہا۔ وہ اپنے اہل خاندان کے ہمیشہ بہت قریب رہے، اتنے قریب کہ بڑے آدمیوں کی زندگیوں میں ایسی کوئی دوسری مثال شاید ہی تلاش کی جاسکے اور یہ اس زمانے میں ہوا جب گھر میں مردوں کی دلچسپی کم ہوتے ہوتے برائے نام رہی گئی ہے۔ برصغیر کی عسکری تاریخ کے اس نادر جرنیل کی شخصیت اور مزاج کی تشکیل میں اس رویے کا دخل بہت گہرا ہے۔

بوا جی جو کہانیاں سنایا کرتیں وہ سب کی سب غم ناک نہیں تھیں۔ وہ اپنے بیٹے کے، بچپن اور لڑکپن، جس کا نام وہ بہت لاڈ سے لیا کرتی تھیں، کامیابیوں کا تذکرہ بڑے فخر اور مسرت کے ساتھ کرتیں۔ وہ ایسی کہانیاں بھی سناتیں کہ ماحول گلزار ہوجاتا۔ بوا جی کے پاس کچھ روپیہ اور زیور تھا اور ہر چند کہ حویلی کی اونچی دیواروں کے اندر کسی لٹیرے کے داخل ہونے کا کوئی حقیقی اندیشہ موجود نہ تھا۔ کبھی کبھی ان کے دل میں خیال آتا کہ اگر ان کے گھر میں چور آگھسے تو کیا ہوگا۔ وہ ہر رات اونچے دروازوں اور کشادہ کھڑکیوں کی چٹخنیاں بڑے اہتمام سے بند کرتیں۔ اختر نے جو تب پرائمری کا طالب علم تھا اور خاندان کی توجہ کا مرکز ہونے کی وجہ سے خود کو بڑا اہم اور مضبوط سمجھنے لگا تھا ایک بار ان سے کہا کہ وہ پریشان کیوں ہوتی ہیں۔ وہ اسے ایک پستول خرید دیں اور بے فکر ہوجائیں۔ اس نے کہا: اگر کسی چور نے ان کے گھر میں گھسنے کی کوشش کی تو وہ اسے گولی مار دے گا۔

ایک صبح جب بوا جی نماز فجر کے وقت بہت دیر تک نیند کے مارے لڑکے کو بیدار کرنے کی کوشش کرتی رہیں لیکن وہ بستر سے جدا ہونے پر آمادہ نہ تھا انہیں مذاق سوجھا اور انہوں نے اختر کے کان میں سرگوشی کی ''چور اختر! گھر میں چور گھس آئے ہیں۔'' پھرتی سے وہ اٹھا اور اس نے تکیے کے نیچے سے کھلونا پستول نکال کر پٹاخے داغنا شروع کردیئے۔ اسے یقین تھا کہ اس کے پاس اصلی پستول ہے جس سے وہ چور کو ہلاک کردے گا۔ لڑکے کی بدحواسی پر سب لوگ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ شام تک یہ لطیفہ حویلی سے نکل کر محلے کے دوسرے گھروں تک پہنچ چکا تھا اور بیچارے اختر کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔

بوا جی کی یادوں میں جگمگاتے دنوں میں سے ایک وہ تھا جب میٹرک کے امتحان کا نتیجہ نکلا اور معلوم ہوا کہ اختر نہ صرف امتیازی نمبروں سے پاس ہوگیا ہے بلکہ وہ وظیفہ حاصل کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ ایک لائق طالب علم کے طور پر اب اس کی شہرت پورے قصبے میں پھیلتی جارہی تھی۔ اب وہ کشتی کے علاوہ کبڈی اور فٹ بال کھیلنے لگا تھا جو اس عہد میں نوجوانوں کے محبوب مشغلے تھے کہ ابھی کرکٹ کا کھیل قصباتی زندگی میں داخل نہ ہوا تھا اور محض امراء کا چونچلا سمجھا جاتا تھا۔ اب جستروال کے گھروں میں اس لڑکے کا ذکر ایک افسانوی کردار کے طور پر ہونے لگا جو بے داغ لباس پہنتا تھا، کمرہ جماعت سے کبھی غیر حاضر نہ ہوا تھا، اعلیٰ درجے کا کھلاڑی تھا جس نے کبھی بری بات منہ سے نہ نکالی تھی اور جس کی بیوہ ماں اس پر فخر کرتی تھی۔ آخر کیوں

نہ ہو، وہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن کا بیٹا تھا جو اونچے طرے کی پگڑی باندھے پشاور سے جستر وال آیا کرتے تھے اور کسی سے بلاضرورت بات نہیں کرتے تھے۔ کیوں نہ ہو، وہ اس خاندان کا فرزند تھا جس کے بڑوں نے مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں سے لڑائیاں لڑی تھیں۔ بدرالدین خان کا پڑپوتا جو 1857ء میں گھوڑے پر سوار انگریزوں سے لڑنے گئے اور لوٹ کر نہیں آئے۔ ''دیکھ لینا ایک دن وہ اپنے خاندان کا نام روشن کرے گا'' دیئے کی ٹمٹماتی روشنی میں کوئی بڑھیا اپنے بچوں کو اس کی مثال دیتے ہوئے سمجھاتی۔ جستر وال کے کسی بازار میں سائیکل دوڑاتے لڑکے پر کسی مسلمان بوڑھے کی نظر پڑتی تو اس کی آنکھوں میں چمک آجاتی ''اچھا تو یہ ہے بلند خان کا وہ پوتا''۔

برصغیر میں آزادی کے نعرے کی گونج تیز تر ہوتی جارہی تھی، جستر وال کے بڑے بوڑھوں اور اخبار پڑھنے والے نوجوانوں کو معلوم تھا کہ ڈاکٹر اقبالؒ کے کہنے پر قائداعظمؒ لندن سے لوٹ آئے ہیں اور مسلم لیگ کے صدر بن گئے ہیں۔ اخباروں میں گاندھی، نہرو، عطاءاللہ شاہ بخاری اور ظفر علی خان کا تذکرہ ہوتا۔ آئے روز اجنالہ اور امرتسر میں بڑے بڑے جلسے ہوتے جہاں بیس سال پہلے جنرل ڈائر نے سینکڑوں سکھوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کو بھون ڈالا تھا۔ مجلسوں اور گفتگوؤں میں اب اس سوال پر بھی بحث ہوتی کہ جب انگریز چلے جائیں گے تو ''بادشاہی'' کسے ملے گی؟ کیا ہندو، سکھ اور مسلمان اکٹھے رہ سکیں گے۔ کوئی بوڑھا داڑھی کھجاتے ہوئے احراریوں اور کانگرسیوں کو کوستا اور دوسروں کو بتاتا کہ اندر سے انگریز ہندو اور سکھ سب ایک ہیں اور مسلمانوں کی تباہی کے درپے ہیں۔ کوئی تاجر سودا سلف کی خریداری کے لیے لاہور کی طرف جانکلتا اور ہمت کرکے گڑھی شاہو والے مکان میں اقبالؒ کو سلام کرنے چلا جاتا تو واپسی پر خبر لاتا کہ شاعر کی نظر بہت کمزور ہوگئی ہے، وہ بیمار رہتے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ اب محمد علی جناحؒ ہی اس قوم کو مشکلات سے بچاسکتا ہے۔ آئے دن کے جلسوں، جلوسوں کے باوجود شہروں اور قصبوں میں امن تھا۔ دوسری عالمگیر جنگ ابھی شروع نہیں ہوئی تھی اور سارا ماحول جیسے آنے والے کل کے انتظار میں تھا۔

چودہ سالہ اختر اس سب کچھ سے بے نیاز اپنی ذاتی زندگی میں مگن تھا اسے تو بس ایک ہی فکر کھائے جاتی تھی وہ جلد از جلد اپنی تعلیم مکمل کرے اور اپنی بواجی کو ساری فکروں سے بے نیاز کردے، وہ انہیں بڑا افسر بن کر دکھا دے اور ان سے شاباش حاصل کرے۔ اسے انگریزوں سے کوئی دلچسپی تھی نہ ان سے لڑنے والے لیڈروں سے۔ یہ درست تھا کہ سکھوں نے اس کے اجداد کی جاگیر چھین لی تھی اور وہ بازاروں میں اکڑ کر چلتے تھے۔ یہ بھی درست تھا کہ ہندو مسلمانوں سے نفرت کرتے تھے اور صوبوں میں کانگرس کی حکومتیں قائم ہونے کے بعد وہ مسلمانوں کے ساتھ اور زیادہ حقارت سے پیش آنے لگے تھے لیکن وہ کیا کرے اس کا مسئلہ تو آنے والا کل تھا اور اس کی بواجی۔

اختر نے ابھی میٹرک کا امتحان دیا تھا۔ جب اس نے ماں سے پوچھنا شروع کیا کہ اس کی آئندہ تعلیم کا کیا ہوگا کہ اجنالہ میں تو کوئی کالج موجود نہ تھا۔ بواجی ن اسے مضبوط لہجے میں بتایا کہ وہ اس کی پرواہ نہ کرے اور اپنا دھیان پڑھائی کی طرف مبذول رکھے۔ نوجوان طالب علم نے اس سے یہ مراد لی کہ میٹرک کے بعد اسے امرتسر کے کسی کالج میں داخل کرادیا جائے گا، جہاں وہ ہوسٹل میں قیام پذیر ہوگا۔

جب وہ میٹرک کا امتحان دے کر جستر وال میں انتظار کے دن گزار رہا تھا تو اس سوال پر زور شور سے بحث ہونے لگی کہ اسے کس کالج میں داخلہ لینا چاہیے۔ لڑکے کو اس بات سے بڑی پریشانی لاحق تھی کہ اسے اپنی بہن اور ماں سے دور رہنا پڑے گا اور وہ صرف ہفتہ وار تعطیل کے دن ان سے ملنے آیا کرے گا لیکن خود ماں کی پریشانی بیٹے سے کم نہیں تھی جو اس کی نظروں سے ایک دن بھی اوجھل نہ رہا تھا آخر کار ایک روز انہوں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ وہ اس کے ساتھ جائیں گی جب تک وہ بی اے کا امتحان پاس نہیں کرلیتا اس کا پورا خاندان امرتسر میں مقیم رہے گا۔

اختر کے رشتہ کے ایک ماموں کے توسط سے جو محکمہ ڈاک میں ملازمت کرتے تھے امرتسر میں کرائے کے ایک مکان کی تلاش شروع کردی گئی لیکن

پھر کرائے کے گھر میں رہنے کا خیال بوا جی کو پسند نہیں آیا۔ انہوں نے اپنے بھائی سے کہا کہ وہ ان کے لیے چھوٹا سا گھر خرید لیں۔ ہر معاملے کے سب پہلوؤں پر سوچ بچار کرنے والی بوا جی نے سوچا کہ جب کبھی وہ امرتسر سے واپس آنا چاہیں گی تو یہ مکان بیچ دیا جائے گا۔ اس سے نہ صرف کرائے کی بچت رہے گی بلکہ وہ اپنے ذاتی مکان میں رہ سکیں گی۔ آخر کار محلّہ اسلام آباد میں ایک مکان خرید لیا گیا۔ یہ اس حویلی کی طرح تو نہیں تھا لیکن اس میں تین کمرے تھے اور خاندان کی ضرورت ک مطابق اس میں ہر سہولت موجود تھی۔ اس مکان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہ اختر کے ڈاک خانے والے ماموں کے گھر سے قریب تھا۔ تو اب سامان باندھ کر ریڑھوں اور اکوں پر لاد دیا گیا۔ حویلی والوں نے خوش سلیقہ بہو کو گلے لگا کر رخصت کیا۔ جستر وال میں قیام کے دوران اپنی اس سوتیلی بیٹی کے علاوہ جو اس کے مرحوم شوہر کی یادگار تھی، اس نے مڈل تک تعلیم دلانے کے بعد ایک جانے بوجھے بھلے خاندان میں اپنی بڑی بیٹی سلطان کی شادی کر ڈالی تھی۔ بوا جی اب 45 سال سے زیادہ کی ہو گئی تھیں۔ عبادت کی کثرت سے اب ان کے چہرے پر ایک گہری ملائمت آ گئی تھی اب وہ عینک لگاتی تھیں اور پہلے سے بھی زیادہ دھیمے لہجے میں بات کرنے لگی تھیں۔ اس حویلی کی تاریخ میں اس سے پہلے یہ کبھی نہیں ہوا تھا کہ کوئی بہو اپنی اولاد کو ساتھ لے کر اس طرح شہر میں جا بسے لیکن اب زمانہ بدل رہا تھا اور پھر یہ کہ بوا جی جب کوئی فیصلہ کر چکتیں تو وہ کسی کی سنتی کب تھیں۔ حویلی کے پچھلے دس سالوں کی سب یادیں خوشگوار نہیں تھیں لیکن پھر بھی رخصت کا وقت آیا تو سب اہل خاندان الوداع کہنے کے لیے جمع ہوئے۔ بڑے بوڑھوں نے نصیحت کرتے ہوئے بہو کے سر پر ہاتھ رکھا کہ شہر میں پاس پڑوس والوں سے محتاط رہنا، اختر کو مشورہ دیا گیا کہ وہ اپنی ماں کا خیال رکھے۔ بڑی بوڑھیوں نے دعائیں دیں۔ گلے ملنے کا وقت آیا تو بار بار کہا سنا معاف کرنے کا کو کہا گیا اور آنکھیں بھر آئیں۔ اکے چل پڑے اور الوداع کہنے والوں کی نظریں دور تک دیکھتی رہیں۔

اختر کے لیے امرتسر کے اسلامیہ کالج کا انتخاب کس بنیاد پر عمل میں آیا، یہ بتانے والا کوئی نہیں کہ اس میں کس کا مشورہ شامل تھا۔ بظاہر اس کالج کا سب سے بڑا امتیاز یہ تھا کہ یہ مسلمانوں کے ان تعلیمی اداروں میں سے ایک تھا جو مسلمانوں نے سرسید کی علی گڑھی یونیورسٹی کے اتباع میں برصغیر کے مختلف شہروں میں قائم کیے۔ کالج کے پرانے طالب علموں میں سے بعض کا کہنا ہے، یہ امرتسر کے خالصہ کالج کے جواب میں قائم کیا گیا تھا۔ اولاً یہ ایک ہائی سکول تھا جہاں رائج نصاب کے علاوہ مسلمان بچوں کی تعلیمی ضروریات کو ملحوظ رکھا جاتا تھا اور بعد میں انٹر اور ڈگری تک وسیع کر دیا گیا۔ کچھ بھی ہو پڑھائی اور نظم کے اعتبار سے یہ بہترین اداروں میں سے ایک مانا جاتا تھا جس کے پرنسپل ڈاکٹر سر علامہ محمد اقبالؒ کے چہیتے ایم ڈی تاثیر تھے۔ فیض احمد فیض کالج میں اردو شاعری پڑھایا کرتے۔ کبھی کبھار وہ عربی کی کلاس بھی لیتے اور کوئی دوسرا استاد رخصت پر ہوتا تو اس کی جگہ انگریزی بھی پڑھاتے۔ وہ کالج کے برآمدوں میں کوئی فارسی مصرعہ گنگناتے دکھائی دیتے۔ کالج کے دوسرے استادوں میں بھی، بہت سے لائق لوگ موجود تھے۔ خطرے سے دوچار مسلمان قوم کے کئی بہترین دماغ اس کی درس گاہوں میں دکھائی دیتے تھے۔

اختر ابھی چودہ سال کا تھا! اپنے سارے ہم جماعتوں سے کم عمر، ابھی اس کی داڑھی مونچھ بھی نہیں پھوٹی تھی لیکن وہ زیادہ کم عمر دکھائی نہ دیتا تھا۔ نکلتے ہوئے قد اور کسرتی جسم کے ساتھ اب وہ ایک خوش باش اور پر اعتماد آدمی تھا۔ وہ ہمیشہ سلیقے کا لباس پہنے ہوتا اور غیر ضروری گفتگو سے گریز کرتا۔ اس نے سوال کرنے والوں کے سوا کسی کو نہیں بتایا کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور کس خاندان سے اس کا تعلق ہے اور اس بات کا تو اس نے کسی سے تذکرہ تک نہیں کیا کہ اس کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔

ایک اور اہم بات یہ تھی کہ وہ لڑائی جھگڑے سے ہمیشہ گریز کرتا تھا۔ امرتسر والوں کو جو لڑنے جھگڑنے کے بہت شوقین تھے یہ بات بہت عجیب محسوس ہوتی تھی کہ ایک بظاہر مرعوب نہ ہونے والا صحت مند نوجوان پنجہ کشی سے اس قدر گریزاں ہو لیکن اس میں کچھ اور عجیب باتیں بھی تھیں۔ وہ شام کو کمپنی

باغ کے اکھاڑے میں جاتا۔ کبڈی اور فٹ بال اور سائیکلنگ کے میچوں میں حصہ لیتا لیکن گھر سے باہر کوئی چیز کھانے پر آمادہ نہ ہوتا۔ امرتسر متنوع کھانوں کا ایک بازار تھا جہاں پنجاب، دہلی اور کشمیر کے بعض بہترین باورچی موجود تھے۔ اس تجارتی مرکز میں دور دراز سے لوگ خریداری کرنے آتے۔ ہوٹل سیاسی کارکنوں، شاعروں اور دوسری مجلس آرائی کرنے والوں سے آباد رہتے لیکن اختر کسی ہوٹل میں بیٹھتا اور نہ کچھ کھاتا پیتا، چائے کی ایک پیالی بھی نہیں۔

دوسرے لڑکوں کے برعکس اس کی جیب میں ہمیشہ کچھ روپے ہوتے لیکن عام طور پر یہ ویسے کے ویسے ہی رکھے رہتے۔ اسے خریداری سے دلچسپی تھی نہ اظہار ذات سے۔ کھیلوں کے سوا کسی دوسری اجتماعی سرگرمی سے بھی نہیں۔ وہ سیاست پر جو اس شہر میں گفتگو کا سب سے بڑا موضوع تھا خال ہی کبھی بات کرتا۔ اس کی کبھی کسی ہندو یا سکھ لڑکے سے دوستی نہ ہو سکی۔ وہ انہماک سے اپنی کتابیں پڑھتا یا ورزش میں مگن رہتا۔ کمپنی باغ میں ڈنٹر پیلتے یا بیٹھکیں لگاتے جواں سال آدمی کے چہرے پر پسینے کے قطرے چمکتے تو کبھی کوئی راہگیر اسے دیکھنے کے لیے رک جاتا۔ اس کے کاندھے کشادہ تھے اور سینہ فراخ۔ بال سلیقے سے ترشے ہوئے اور رنگ سرخ و سفید۔ نوجوان کی آنکھوں میں چمک تھی اور چہرے پر ایک بھولپن اور اعتماد۔

وہ ان نوجوانوں میں سے ایک تھا جن کی دلکشی کی تعریف کی جاتی ہے اور جنہیں چلمنوں کے پیچھے سے تحسین ہم بات چیت کر رہے تھے وہ ایک اور طرح کا آدمی تھا۔'' کچھ ہی دن بعد لاہور میں کبڈی کا ایک بڑا میچ ہوا جسے گورنر سر ہنری کریک اور وزیراعلیٰ خضر حیات دیکھنے آئے۔ مقابلے میں لدھیانہ، امرتسر، جالندھر، پٹیالہ، ہوشیار پور، گجرات، سرگودھا اور لاہور کی ٹیمیں شریک تھیں۔ اختر انعام حاصل کرنے والے نمایاں کھلاڑیوں میں شامل تھا۔ بعد میں اس نے کالج کے بہترین اتھلیٹ کا اعزاز بھی حاصل کیا۔ ایم ڈی تاثیر اور فیض ایسے ناموروں کی موجودگی میں اختر کے پسندیدہ استاد فارسی کے مقبل حسین تھے۔ درویش منش اور علم کی سرمستی سے سرشار مقبل ہر صبح لاہور سے آیا کرتے اور زندگی کے مادی پہلو سے بہت کم دلچسپی رکھتے تھے۔

1941ء میں جب دنیا عالمگیر جنگ کی تباہیوں سے لرز رہی تھی۔ اختر نے اکنامکس میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لینے کا فیصلہ کیا۔ یہ اسی سال قدیم ادارہ، جس کی تعمیر پنجاب کی تسخیر کے بعد انگریزی حکومت کی اولین ترجیحات میں سے ایک تھی، اپنے معیار اور روایات کی وجہ سے اس پورے علاقے کا شاید سب سے پُرکشش ادارہ تھا۔ ان کے لیے جو تعلیم حاصل کرنے میں واقعی سنجیدہ ہوتے تھے اور ان کے لیے جو آگے بڑھنے کا خواب دیکھتے تھے پورے پنجاب کا (جس میں بھارت کا مشرقی پنجاب بھی شامل ہے) جوہر قابل اس ادارے میں کھنچتا چلا آتا تھا اور منتخب لوگ ہی اس پرشکوہ عمارت کے مرکزی دروازے سے داخل ہونے کا اعزاز حاصل کر پاتے تھے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے طالبعلموں سے متانت اور محنت کی توقع رکھی جاتی تھی۔ دوسرے تعلیمی اداروں کے برعکس جہاں اب کانگرس اور مسلم لیگ کی حامی طلبہ تنظیمیں منظم ہو رہی تھیں، گورنمنٹ کالج کے طالب علم سیاست سے دور رہتے تھے۔ وہ کرکٹ کھیلتے تھے، مباحثوں میں شریک ہوتے تھے، لائبریری میں وقت گزارتے تھے اور اپنے لائق اساتذہ کے لیکچر سنتے تھے۔ انہیں بتایا جاتا تھا کہ اس کالج کے در و دیوار نے کیسے کیسے نامور اساتذہ اور طلبہ کو دیکھا ہے۔

شورشرابے والے امرتسر کے ایم اے او کالج کے برعکس جس سے اختر کبھی قلبی تعلق محسوس نہ کر سکے، لاہور کا گورنمنٹ کالج ہمیشہ ان کے دل کے قریب رہا۔ شاید اس کی تدریسی فضا، نظم، رہنما اور مرتب ماحول ان کے مزاج سے گہری مطابقت رکھتا تھا۔ ان کی والدہ محترمہ امرتسر والا گھر بیچ کر اپنی بیٹی کے ساتھ جستر وال چلی گئی تھیں اور وہ کالج کے نیو ہوسٹل میں مقیم تھے۔ شام کو وہ اپنے دوستوں کے مختصر سے گروپ کے ساتھ گول باغ کے عقب میں مال سے گھوم کر سیکرٹریٹ یا انارکلی کی طرف جانے والے خاموش راستے پر چہل قدمی کرتے نظر آتے۔ وہ کالج میں تعلیم کے اعتبار سے تو کوئی خاص امتیاز نہ رکھتے تھے۔ جہاں بعد ازاں نوبل انعام پانے والے ڈاکٹر عبدالسلام سمیت کئی سرکردہ اور سرفراز نوجوان موجود تھے لیکن وہ کھیلوں میں ضرور

نمایاں تھے۔اب سائیکلنگ ،کبڈی اور کشتی کے ساتھ ساتھ وہ باکسنگ بھی کرنے لگے تھے بعد میں وہ کبھی کبھار ایک ہندو باکسر سے مقابلے کا واقعہ سنایا کرتے تھے جسے انہوں نے ناک آؤٹ کر دیا تھا اور مقابلہ دیکھتے ہوئے اس کی ماں رنج سے رو پڑی تھی ۔

گورنمنٹ کالج کے ماحول ایسا دھیما مرتب انداز اور ایک باکسر کی جبلت عمر بھر جنرل کے ساتھ رہی جیسا کہ ان کے ایک پرانے ہم جماعت کہتے ہیں جو نیو ہوسٹل میں کچھ دن ان کے ساتھ ایک کمرے میں مقیم رہے'' دھیما اور منصوبہ ساز، توجہ مرکوز رکھنے والے، منظّم اور پاکیزہ، لباس میں پاکیزہ، خیالات میں پاکیزہ، غازی، خوش باش۔'' جنرل کے پرانے ساتھی کو جو بعد میں کبھی ان سے نہیں ملے، اس پر کبھی حیرت نہیں ہوئی کہ اس آدمی نے زندگی میں ترقی کی منزل طے کیں۔ وہ شہرۂ آفاق فلسفی لارڈ برٹرنڈ رسل کا حوالہ دیتے ہیں جس نے کہا تھا کہ ان کے بعض ہم جماعت ان سے زیادہ ذہین تھے لیکن وہ اس لیے شہاب ثاقب کی طرح فضاؤں میں بکھر کر بجھ گئے کہ وہ توجہ مرتکز کرنے والے نہ تھے۔ وہ کہتے ہیں اختر کو اپنے مزاج پر بڑا قابو حاصل ہو گیا تھا'' احساس کمتری نہ برتری میں نے کبھی اسے غرور میں مبتلا دیکھا اور نہ غصے میں۔'' یہ ایک جہاندیدہ آدمی کا نہیں 19 سالہ لڑکے کا ذکر ہے جو اب ایم۔اے کے دوسرے سال میں تھا۔

کیا اختر کو عالمگیر جنگ کے نشیب و فراز سے جو تاریخ عالم کا شاید سب سے ہولناک واقعہ تھی، برصغیر میں پر ہیبت سیاسی واقعات سے، منظر پر ابھرنے والے نئے سیاسی رہنماؤں اور ان عوامل سے کوئی دلچسپی نہ تھی جو مستقبل کی صورت گری کرنے والے تھے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے یقیناً انہوں نے کچھ نتائج اخذ کیے ہوں گے ان کی کچھ رائے رہی ہو گی لیکن مضبوط ارادوں کے اس آدمی کو اپنی رائے ظاہر کرنے کی بے تابی نہیں تھی۔

کیا قدرت کو ان سے کوئی بڑا کام لینا تھا جو انسانی کردار اور مزاج کی تشکیل کرنے والا سب سے بڑا عنصر ہے؟ کیا کبھی اس جواں سال نے اس پر غور کیا تھا؟

1945ء میں انہوں نے ایم اے کا امتحان پاس کر لیا لیکن اب کی بار وہ صرف سیکنڈ ڈویژن حاصل کر پائے اگرچہ اس زمانے میں جب ممتحن رعایت دیتے تھے اور نہ نقل کرنے کا کوئی امکان تھا، یہ بھی ایک اعزاز سمجھا جاتا تھا۔

تو لیجئے، اب ہمارے سامنے ایک جوان رعنا ہے پولیس کی وردی میں ملبوس، قد پونے چھ فٹ، امتیازی نشان بائیں رخسار کے نیچے ایک نمایاں مسا۔